ایک درویش محقق

کسی عارف نے کیا خوب کہا ہے کہ کسی صاحب علم کی سب سے بڑی خوبی یہ ہوتی ہے کہ اس کا علم کردار میں ڈھل جاتا ہے۔ علم و تحقیق کی صلاحیت ہو یا عبادت و ریاضت کا ذوق، اگر یہ صلاحیتیں انسان کے نفس کا تزکیہ کرنے میں کامیاب نہ ہوسکیں تو ہوسکتا ہے کہ کوئی شخص کسی درجے میں اچھا محقق بن جائے یا ''صاحب کشف و کرامات'' ہو جائے، لیکن وہ قرآن کا مقصود انسان بہرحال قرار نہ پا سکے گا۔ اس پہلو سے جب ہم مرحوم عبدالستار غوری کی زندگی پر ایک نظر ڈالتے ہیں تو صاف محسوس ہوتا ہے کہ وہ صاحب کردار محقق اور درد دل رکھنے والے بزرگ تھے۔ بائیبل میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں موجود پیشین گوئیوں کو اپنی تحقیق کا محور بنانے والے ان بزرگ کے دنیا سے چلے جانے کی خبر پر دل و دماغ پر جو پہلا اثر ہوا، وہ یہی تھا کہ عظمت کردار کے لحاظ سے قحط الرجال کا شکار یہ معاشرہ کچھ اور تہی دامن ہو گیا ہے۔

ان سے تعلق کی نوعیت ایک بہت سینئر کولیگ کی بھی رہی اور ہمدرد بزرگ کی بھی۔ جن علمی مجالس میں انھوں نے اپنی تحقیق کے نکات پیش کیے، ان میں بھی شرکت کا موقع ملا، لیکن ان سے جو تعلق بن پایا، وہ ایک مشفق بزرگ ہی کا تھا۔ وہ تعلق کو صرف علمی گفتگو تک ہی محدود رکھنے کے قائل نہ تھے، بلکہ بڑے غیر محسوس طریقے سے بے تکلفی پیدا کر لیتے اور جہاں کہیں انھیں دوسرے کی مدد کا موقع نظر آتا، وہ خود آگے بڑھ کر مدد فرماتے۔ ۲۰۰۲ء میں جب انھیں علم ہوا کہ مجھے ماہنامہ ''آنکھ مچولی'' کے پراجیکٹ میں شدید مشکلات کا سامنا ہے اور اچھا خاصا مقروض ہو چکا ہوں تو انھوں نے خود مجھ سے رابطہ کیا۔ بچوں کی کردار سازی پر کام کرنے والی ایک این جی او سے میرا تعارف کرایا اور بعض

نصابی کتب مرتب کرنے کا کام دلوایا۔ اس سے میرے اوپر واجب الادا کئی قرض ادا ہو گئے۔ اس موقع پر مجھے معلوم ہوا کہ ان کا یہ رویہ مجھ تک ہی محدود نہیں، بلکہ ادارے کے ضرورت مند ملازمین کے ساتھ ان کا رویہ بطور خاص ان کی پہچان ہے اور وہ مدد کرتے وقت اس بات کا بہت خیال رکھتے کہ کسی کی عزت نفس مجروح نہ ہو۔ ان کا طرۂ امتیاز ان کا سادہ رہن سہن تھا۔ ان کے لباس، رہایش، طعام اور عادات، سب میں ایک پروقار سادگی تھی۔ اس لحاظ سے، بلاشبہ وہ ہمارے اسلاف کی علمی روایت کے تسلسل کی زندہ مثال تھے۔ چنانچہ وہ چند احباب ان کی تنقید کی زد میں رہتے جو ان کو معیار زندگی بلند کرنے کے چکر میں خواہ مخواہ خجل خراب ہوتے نظر آتے۔

وہ اکثر اوقات ''المورد'' میں اپنے کمرے ہی میں رہتے۔ ان کے لیے اپنا علمی کام کرنا کوئی ڈیوٹی کا معاملہ نہ تھا، بلکہ ''المورد'' ہی ان کا گھر اور یہی ان کی ساری سرگرمیوں کا مرکز بھی تھا۔ اس کی وجہ یقیناً یہی تھی کہ ان کی زندگی کا مقصد صرف اور صرف اپنے تحقیقی پراجیکٹ کو اپنے متعین کردہ معیار پر جلد از جلد پورا کرنا تھا۔ وطن عزیز پاکستان پر جب دہشت گردی کا عذاب مسلط ہوا اور ادارے کو عملی طور پر اپنی سرگرمیوں کو بہت محدود کرنا پڑا تو ان کے معمولات زندگی بھی بری طرح متاثر ہوئے۔ اس دوران میں، میرا جب بھی ''المورد'' جانا ہوا، وہ مجھے وہیں نظر آئے۔

بے رونق ''المورد'' کو دیکھ کر جی ہمیشہ بری طرح کڑھتا۔ سوچتا یہ وہ وہی مادر علمی ہے جس کے ساتھ ہم نے بڑے بڑے خواب وابستہ کیے تھے، جس کے ساتھ منسلک ہونے کے مقابلے میں خوش حال کیریئر کی فکر کو ایمان کی کمزوری سمجھا تھا۔ جہاں استاد محترم جناب جاوید احمد صاحب غامدی کو دیکھ کر آنکھیں ٹھنڈی ہوتی تھیں، جہاں رفیع مفتی، طالب محسن، ساجد حمید، شہزاد سلیم، منظور الحسن، خالد ظہیر، سمیع مفتی، ڈاکٹر منیر، معز امجد، محمد بلال اور بعد میں آنے والے دیگر رفقاے کار دل و دماغ کی تازگی کا سبب تھے۔ اب جب وہاں جانا ہوتا تو پرانے لوگوں میں محمد اشرف، محمد حفیظ، عظیم ایوب، محمد فاروق، نعیم احمد، عمران خان اور دیگر احباب اپنے اپنے دائرۂ کار میں اب بھی خدمت کے لیے ہر دم تیار نظر آتے۔ لیکن صاحب علم لوگوں میں صرف عبدالستار غوری ہی نظر آتے۔ ان کی وفات کی خبر سنی تو دل واقعی کٹ کر رہ گیا۔ خیال ہوا کہ اب واقعی ''المورد'' میں علمی کتابیں ہی بچی ہیں۔ اپنے معاشرے کی اخلاقی اور علمی زبوں حالی کا احساس مزید گہرا ہو گیا اور ان کے سانحۂ ارتحال کا صدمہ تو اس وقت مزید سوا ہو گیا جب ان کے جنازے میں بہت کم دوستوں سے ملاقات ہوئی۔

سوچتا ہوں کہ کاش! کم از کم اتنا ہی انتظام ہو جائے کہ کمپیوٹر سے ماورا ہو کر ہم سب دوست، احباب کے مرنے

جینے اور شادی بیاہ پر ہی اہتمام سے اکٹھے ہو جایا کریں۔ اگر کمپیوٹر ہی ہر مرض کی دوا ٹھہری تو کم از کم مجھے تو یہ اندیشہ لاحق ہو جاتا ہے کہ کہیں اللہ تعالیٰ کی جنت بھی کمپیوٹر ہی کا کوئی چکر نہ ہو!

—— نعیم احمد بلوچ

(سابق رکن مجلس ادارت، ماہنامہ اشراق)